Oriental College Magazine, Vol.101, No. 01, Serial No. 379, 2025

# غالبؔ اور اقبالؔ کا سائنسی شعور: تقابلی مطالعہ

سجاد نقوی

بی ایس ریسرچ اسکالر (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور

عاصم محمد

ویزیٹنگ لیکچرار اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج گل آباد، دیر لوئیر، خیبر پختونخوا

# The Scientific Consciousness of Ghalib and Iqbal
## A Comparative Study with Reference to Urdu Poetry

Sajjad Naqvi
BS Research Scholare Urdu
G.C University Lahore

Asim Muhammad
Visiting Lecturer in Urdu
Govt. Degree College Gull Abad, Dir Lower, KPK

## Abstract

In the context of comparative criticism, the poetry of Ghalib and Iqbal has been a constant and trendy subject. Because both of them have specific intellectual harmony and mental relations. On the basis of this resemblance, many critics have considered Ghalib as the spiritual predecessor of Iqbal. In terms of themes, there are many common subjects in the poetry of Ghalib and Iqbal. In the light of the covenant, intellectual sources and the scientific consciousness of their Urdu poetry, efforts have been made to compare and interpret it in a comparative manner. The purpose of this article is not to prove Ghalib and Iqbal as scientists. Rather, it aims to highlight their elevated imagination and modern consciousness, which reflect scientific awareness.There is no scientific criticism of this kind of criticism, but it can be a tendency and a generous trend. By the way, modern and modern ideas have provided several tools to look at the poem with a diverse point of view rather than a glance.

**Keywords:**
Scientific Consciousness, Observations, Atoms,Universal Evolution,Big Bang, AI Technology

تقابلی تنقید کے تناظر میں غالؔب اور اقبالؔ کی شاعری مستقل اور رجحان ساز موضوع رہا ہے۔ کیوں کہ دونوں کے یہاں مخصوص نوعیت کی فکری ہم آہنگیاں اور ذہنی و فکری روابط پائے جاتے ہیں۔ دونوں شاعروں کو مشرق و مغرب کے نمائندہ شاعروں کے ساتھ بھی تقابل کے آئینے میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ غالؔب اور اقبالؔ کی شاعری میں کئی موضوعات میں اشتراکات و افتراکات کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ زیر نظر آرٹیکل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں غالؔب اور اقبالؔ کی شاعری میں سائنسی شعور کے حوالہ سے موضوعات کا تقابلی جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ غالؔب اور اقبالؔ ایوانِ سخن میں اُردو زبان و ادب کی دو نمایاں آوازیں ہیں۔ دونوں کو عالمی سطح پر مقبولیت حاصل ہے۔ اقبالؔ کے فکری ماخذ میں غالؔب کو خاص الخاص کا درجہ حاصل ہے۔ اقبالؔ نے غالؔب سے خوب استفادہ کیا اور اس کا اظہار وہ اپنی نظم و نثر میں بھی کرتے ہیں اور غالؔب کی شاعری کو سراہتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ غالؔب اقبالؔ کے لیے ایک پیش رو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اقبالؔ نے جہاں مشرق و مغرب کے مشاہیر سے استفادہ کیا اور اپنے بکھرے خیالات میں انھیں جگہ دی، وہیں غالؔب کا بھی ایک ممتاز مقام نظر آتا ہے۔ اقبالؔ اپنی ڈائری میں یہ بات کھلے دل سے تسلیم کی کہ ان کی فکری اور تخلیقی تربیت میں ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈزورتھ جیسے عظیم مفکرین اور شعرا کا گہرا اثر رہا ہے۔ اقبال کے بہ قول ہیگل اور گوئٹے نے انھیں اشیاء کی گہرائی اور باطنی حقیقت کو سمجھنے کا شعور دیا، جب کہ بیدل اور غالب نے یہ راز عطا کیا کہ مغربی شاعری کے اصولوں کو اپناتے ہوئے بھی، مشرقی جذبات اور طرزِ اظہار کو کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ (۱)

اس نقطہ نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے غالؔب کو عالمی سطح کے مشاہیر میں شامل کیا ہے اور انھیں غالؔب کی عظمت کا خوب اندازہ تھا۔ انھوں نے اس بات کی پیش بینی بھی کر دی تھی کہ غالؔب کی عظمت کا اعتراف ہونا ابھی باقی ہے کیوں کہ غالؔب ان شاعروں میں سے ہیں جن کی فکر و تخیل انھیں مذہب اور قومیت کی حد بندیوں سے بالاتر کر دیتی ہے۔ (۲)

اقبالؔ غالؔب کی فکری روایت کے علَم بردار ہیں۔ انھوں نے بانگِ درا کی اولین نظموں میں ایک نظم میں مرزا غالؔب کو نہایت عمدگی سے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی متنوع شاعرانہ خصوصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کا عنوان بھی "مرزا غالؔب" ہی ہے۔ یہ نظم غالؔب کی شاعرانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اقبالؔ کی غالؔب سے یہ فکری وابستگی آخر تک قائم رہی۔ اس کا ایک اہم حوالہ ان کے آخری دور میں شائع ہونے والی فارسی کتاب "جاوید نامہ" ہے، جو ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آئی۔ یہاں بھی اقبالؔ غالؔب کا تذکرہ ایک منفرد انداز میں کرتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت کو مقدم رکھتے ہیں جس سے ان کی دیرینہ فکری

وابستگی اور عقیدت کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی نظر میں غالبؔ کی اس اہمیت اور قدر و قیمت کی بابت ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

> "اقبال کے نزدیک غالب کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ وہ نہ صرف ایک خاص تہذیب کا آئینہ دار تھا بلکہ ایک بھرپور فکری ورثے کا ترجمان بھی۔ دہلی کی وہ علمی و ادبی فضا، جو ایک زمانے میں زندگی سے بھرپور تھی، غالب کے بعد خاموشی کی تصویر بن گئی۔ غالب کی شخصیت ان اقدار کی پہچان رکھتی تھی جنہیں اقبال نے بھی اپنی فکر اور فن کا حصہ بنایا، اور یہی بات غالب کو اقبال کی نظر میں منفرد بناتی ہے۔" (۳)

درج بالا معروضات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؔ غالبؔ کی نہ صرف شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ غالبؔ کے مکتبِ تخیل سے فیض بھی پاتے ہیں اور یہی فیض یا استفادہ دونوں کی شاعری میں ہم آہنگی اور مشابہت کا ذریعہ ٹھہرتا ہے۔

اقبالؔ اور غالبؔ کی ذہنی و فکری مشابہت و مطابقت پر سب سے پہلی رائے ہمیں سر شیخ عبد القادر کے لکھے "دیباچہ بانگِ درا" میں نظر آتی ہے ان کے خیال کے مطابق کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ غالب کے بعد کوئی ایسا شاعر پیدا ہو گا جو اردو شاعری میں نئی روح پھونکے گا۔ اقبال نے نہ صرف غالب کے تخیل اور انداز کو زندہ کیا بلکہ اردو کے فروغ کا ذریعہ بھی بنے۔ غالب اور اقبال میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اگر تناسخ (دوبارہ جنم) کا تصور مانا جائے، تو یوں لگتا ہے جیسے غالب کی روح نے سیالکوٹ میں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال کی صورت میں شاعری کو نیا رنگ دیا۔ (۴)

اس خیال کے پیشِ نظر اگر غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کی شاعری کا موازنہ کیا جائے تو تطابق کے بہت سے پہلو سامنے آئیں گے۔ البتہ تخالف یا افتراکات کے بھی قوی امکان ہیں۔ کیوں کہ غالبؔ کی شاعری اقبالؔ کی شاعری کی طرح اسلامی تعلیمات کا تاثر پیش نہیں کرتی بلکہ انسان اور فردی زندگی کی ترجمان ہے۔ اقبالؔ ایک نظام اور مقصدیت کے تحت اشعار کہتے ہیں۔ ان کا پیغام یا کلامیہ (Discourse) امتِ مسلمہ کے لیے مخصوص ہے جبکہ غالبؔ کے سامنے کوئی ایسا مخصوص کلامیہ نہیں ہے۔ تاہم دونوں شعراء روشِ عام پر چلنے کے قائل نہیں بلکہ جدت طرازی کے خواہاں ہیں۔ دونوں شعراء کے ہاں مشابہت تو ضرور موجود ہے مگر ایک حد تک۔ کیوں کہ اقبالؔ غالبؔ ہی کے سلسلے کا ایک شاعر ہے۔ لیکن یہ سلسلہ مشابہت کے اعتبار سے ایک حد تک قائم ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ اُردو دنیا کے دو مایہ ناز شاعر اور نابغہ روزگار شخصیات ہیں۔ دونوں نے اپنے قوتِ مشاہدہ اور حسی ادراک سے قدرت کے مظاہر کو شعری پیکر میں منقلب کرنے کی کامیاب کاوشیں کیں۔ دونوں شعراء کی شعری کائنات میں آفاقی سچائیاں صورت پزیر ہیں۔ دونوں شعرا کے ہاں ہمیں جہاں

موضوعات کی کئی جہات نظر آتی ہیں وہیں ایک اہم جہت سائنسی شعور کا حوالہ بھی ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے اس سائنسی شعور کو سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں کے عہد اور سائنسی نوعیت کے فکری ماخذات کا جائزہ لیا جائے۔

غالبؔ کا عہد ایک طرف مٹتی تہذیب اور دوسری طرف ایک نئی استعماری تہذیب کے آغاز کا عہد تھا۔ دراصل یہ عہد ہندوستان میں انگریزوں کے عروج اور مغل حکومت کی زوال پزیری کا عہد تھا۔ غالبؔ کا زمانہ روحانی انحطاط اور مادی پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف گامزن تھا، جہاں انسان کو ایک تصادم اور آویزش کا سامنا کرنا پڑا۔ خود غالبؔ ایک بٹی ہوئی شخصیت کے طور پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس عہد میں سماجی، سیاسی، تعلیمی، معاشی الغرض ہر سطح پر نئی نئی تبدیلیاں جنم لے رہی تھیں اور استعمار کار اپنے ہر حربے میں تیزی سے کامیاب ہوتے نظر آرہے تھے نیز مغربی تہذیب کے کمالات کا خوب چرچا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود غالبؔ نے اپنی تہذیب کو نہیں چھوڑا بل کہ اس کے ساتھ روادار رہنے کا مظاہرہ کیا۔

یہاں یہ خاطر نشیں رہے کہ غالبؔ نئی تہذیب کے مداح اور اسے سراہتے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ انگریزوں کی کارگزاریوں سے بہت متاثر تھے۔ غالبؔ بنارس، لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ کے سفر اور یہاں پر قیام کے دوران انگریزوں کی چکاچوند ترقیوں اور نئی تہذیب کی نیرنگیاں دیکھ چکے تھے۔ اس خیرہ کرتی تہذیب نے غالبؔ کو ایک جدید ذہن کے طور پر تیار کیا۔ غالبؔ انگریزی علوم وفنون سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اپنے خطوط اور تقریظ میں جلوہ افرنگ کے علمی کمالات اور ایجادات کو خوب سراہا ہے۔ اس ضمن میں سر سید کی مرتب کردہ تقریظ آئین اکبری (ابوالفضل) غالبؔ کی روشن خیالی اور سائنسی ایجادات سے واقفیت کا روشن ثبوت ہے۔ اس تقریظ میں غالبؔ سرسید کی سرزنش کرتے ہوئے انھیں وعظ کرتے ہیں کہ مردہ پروری سے کئی گنا بہتر ہے کہ ان انگریزوں کی طرح نئے علوم و فنون اور ایجادات کی طرف توجہ کی جائے۔ اس تقریظ کا نثری ترجمہ ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔۔ سرسید کو اس سے کس قسم کے نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ اگر قواعد و قوانین آئین اکبری پسند آگئے ہیں تو ان کا مقابلہ انگریزوں کے آئین سے کر کے دیکھ لو۔ وہ (انگریز) اس نئی تہذیب اور تمدن میں ایسی ایسی چیزیں لائے ہیں کہ کبھی کسی نے دیکھی سنی نہ تھیں۔ انھوں نے ہنرمندی میں اضافہ کیا ہے اور اگلوں پر سبقت لے گئے ہیں۔ ان سے بہتر ملک داری اور آئین سازی کون کر سکتا ہے۔ آئین کے علاوہ انھوں نے عقل اور انصاف کو باہم ملا دیا ہے۔ ان کی عقل کی یہ سحر کاری ہے کہ چقماق کے بجائے تیلی میں سے آگ نکالتے ہیں۔ دھوئیں سے کشتیاں اور ریلیں چلاتے ہیں۔ نہ ہوا کی محتاجی نہ موج کی ضرورت۔ کشتی ان سے بے نیاز ہو کر دھوئیں سے چلی جا رہی ہے۔ بغیر مضراب کے باجوں سے نغمے نکل

رہے ہیں۔ الفاظ فضا میں پرندوں کی طرح اڑے جاتے ہیں۔ دو لمحوں میں سو کوس کی خبر پہنچا دیتے ہیں۔ ذرا ان کے شہر لندن کو جا کر دیکھو، گلی کوچے روشن ہیں لیکن چراغ میں نہ تیل کی ضرورت نہ بتی کی ہر بات میں سو جدتیں پیدا کر دی ہیں۔ نئے آئینوں کے مقابلے میں پرانے طریقے پرانی جنتری کی طرح بے کار ہو گئے ہیں۔ جب اس قسم کے علوم وفنون کے خزانے سامنے موجود ہوں تو آئین اکبری کے بوسیدہ خرمن کی خوشہ چینی کیوں کی جائے، یہ مردہ پروری کوئی مبارک کام نہیں ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں سخن آرائی کے سوا کیا رکھا ہے۔"(۵)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ روشن خیالی اور سائنسی ترقیوں کو پنپتا دیکھنے کے لیے سرسید سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ کیوں کہ ہندوستان میں مغربی ممالک اور ان کی سائنسی کارکردگی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ صنعتی انقلاب نے جہاں پوری دنیا کو متاثر کیا وہیں اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے۔ ڈاک کے ناقص نظام کی بجائے انگریزی نظام کو رائج کیا گیا، تار اور جہاز رانی کے محکمے قائم ہوئے، تجارت کے لیے ذرائع آمد و رفت میں جدت آگئی اور یہ سب غالبؔ بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ عہدِ غالبؔ میں انگریزی تعلیم اور سائنسی علوم وفنون کا اہم مرکز دلی کالج سمجھا جاتا تھا اور اس کے علاوہ فورٹ ولیم ادارے کی علمی خدمات سب پر عیاں تھیں۔ غالبؔ نے باقاعدہ ان اداروں سے کوئی تعلیم تو حاصل نہیں کی مگر یہ سب ان کے شعور اور وجدان کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ جس نے غالبؔ کو جدید اور سائنسی طرز فکر کا مالک بنایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حامد کاشمیری کی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"برصغیر میں انگریزی نظام تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثرات کے ساتھ جب طباعت (پریس) کی سہولت عام ہوئی، تو ایک فکری انقلاب کی بنیاد پڑی۔ خاص طور پر دہلی میں قائم ہونے والا "دہلی کالج" ترقی پسند خیالات کا مرکز بن گیا، جہاں جدید سائنسی، فلسفیانہ اور ریاضیاتی علوم کو فروغ ملا۔ ان علوم کی روشنی نے سماج کے ساتھ ساتھ غالب جیسے حساس ذہنوں کو بھی متاثر کیا۔ غالب کو قدیم تعلیمی نظام میں محدودیت اور بے عملی کا احساس ستاتا تھا، جبکہ وہ نئے سائنسی و عقلی علوم کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کے اثرات کو تسلیم بھی کرتے تھے۔"(۶)

غالبؔ اپنے عہد کے رمز شناس اور گہرا سیاسی شعور رکھنے والے شاعر تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ آئندہ کا انسان ان ترقیوں کے بغیر ادھورا اور ناکام رہے گا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے خطوط میں بھی لوگوں کو جدید علوم کی طرف راغب ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ میر مہدی کے نام اس خط سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں مرزا غالب میر مہدی کے بھائی، میر سرفراز حسین کو فقہ کے بجائے منطق و

فلسفہ اور ہیئت و نجوم پڑھنے کا وعظ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب ایک ایسے عہد کا پروردہ تھا جہاں ایسے علوم شدت سے پروان چڑھتے دکھائی دے رہے تھے اور فلسفیانہ مباحث اپنے جوبن پر تھے۔ غالب ان پنپنے والے مباحث پر گہری نظر رکھتے تھے اور انھیں علمِ طب سے بھی گہری واقفیت تھی۔ استعمار کاروں کے زیر سایہ غالب کا ترقی کرتا عہد اور یہ تمام معروضات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہی وہ تمام محرکات اور تخلیقی ماخذ تھے جنھوں نے غالب کو ایک جدید ذہن بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور غالب کے شعر و نثر سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب جدیدیت کے نکتہ آغاز ہیں۔ غالب نے اس جدید دور کے آغاز اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی۔ اس لیے شعوری و لاشعوری طور پر غالب کی شاعری میں سائنسی شعور کی پرچھائیاں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

دوسری طرف اقبال کا عہد ہے۔ غالب اور اقبال کے درمیان ایک زمانی بُعد پایا جاتا ہے۔ غالب کے انتقال (۱۸۶۹ء) کے قریباً آٹھ سال بعد اقبال کا جنم (۱۸۷۷)ہوا۔ یہ زمانی بُعد کوئی زیادہ تو نہیں لیکن غالب کے ترکِ سخن اور اقبال کے آغازِ سخن کے درمیان لگ بھگ چالیس برس کا عرصہ حائل ہے۔ اقبال کے زمانے میں ہندوستان میں کئی تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے۔ جو مختلف جدید علوم و فنون کے فروغ میں سرگرم تھے۔ اقبال کو بچپن ہی سے حصولِ علم کا شوق تھا۔ لہٰذا انھیں ان تعلیمی اداروں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں انھیں آرنلڈ جیسا مشفق استاد میسر آیا، جس نے اقبال کے تبحرِ علم کو جلا بخشی۔ اقبال نے ان تعلیمی اداروں سے کامیابیاں سمیٹنے کے بعد یورپ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا رخ کیا۔ اقبال کو کیمبرج، میونخ اور لنکن ان جیسے مشہور اداروں میں پڑھنے کا موقع ملا اور یہاں سے آپ نے بیرسٹری سمیت ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال غالب سے زیادہ خوش قسمت اور اقبال مند ثابت ہوتے ہیں کہ انھیں مشرق و مغرب کی جید درس گاہوں میں باقاعدہ اکتسابِ علم کے سنہری مواقع میسر آئے اور استادانِ علم و فن سے استفادے کا موقع ملا۔ جبکہ غالب کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

اقبال کا عہد بھی نت نئی تبدیلیوں سے روشناس ہوتا دور تھا۔ اس عہد میں نو آبادیاتی نظام اور استعمار کاروں نے برصغیر پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں پابجولاں تھا۔ ہندو اور مسلم فساد کی لہریں عروج پر تھیں اور اس حرکت کے پیچھے فرنگی ذہن تھا جو انھیں لڑوانے میں مصروف عمل تھا۔ استعماریت اور استبداد نے سیاسی، معاشی، ذہنی الغرض ہر طرح سے ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا اور یہاں کے مقامی لوگ دو جذبی تصادم کا شکار تھے۔ اقبال مسلمانوں کی اس ابتری اور مغلوب حالت پر نوحہ

کناں ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعہ ان میں ولولہ و جوش اور تحرک کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی شاعری ایک مخصوص ڈسکورس کو جنم دیتی ہے۔

غالب کے زمانے میں سائنسی ترقیوں اور ایجادات ابھی رینگنے چلنے کے مرحلے میں تھیں جب کہ اقبال کے زمانے تک انھیں تیز رفتاری کے پَر لگ چکے تھے۔ سائنسی نظریات اور ایجادات کی ہر طرف خوب دھوم تھی۔ اقبال نے یورپ میں رہتے ہوئے اس سارے ارتقا کو بہت قریب سے دیکھا اور جلد ہی سارے منظر نامہ کو بھانپ لیا تھا۔ اقبال خود بھی سائنسی علوم و فنون میں گہری دل چسپی رکھتے تھے اور یہ دل چسپی ان کے عصر کا تقاضا تھی۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا اپنے مضمون "مطالعہ سائنس اور اقبال" میں لکھتے ہیں:

> "اقبال سائنس داں نہیں تھے۔ وہ سائنس کے باقاعدہ طالب علم بھی نہیں تھے تاہم ان کے کلام اور خطبات، مکتوبات اور ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سائنس سے دِلی شغف تھا، اس کی ایک وجہ تو بظاہر یہ تھی کہ جدید سائنس کی ترقیات، اکتشافات اور ایجادات پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ سائنس کی یہی قوت ہے، جس کے باعث اہل یورپ ایک طرف تو سیاسی اور معاشی طور پر ساری دنیا پر چھا گئے ہیں اور دوسری طرف قوائے فطرت سے کام لے کر روز بروز کائنات کی تسخیر میں آگے بڑھ رہے ہیں۔"(۷)

اقبال اپنے عہد کے قبل از اور بعد از قریباً تمام بڑے فلسفیوں اور سائنس دانوں کے تصورات سے آگاہ تھے۔ ان میں سقراط، افلاطون، ارسطو، کانٹ، نیوٹن، آئن سٹائن، میکس پلانک، ہائزن برگ، وائٹ ہیڈ، اوس پنسکی، فرائیڈ، ولیم جیمز اور برگاس وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے انگریزی خطبات کی کتاب "تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ" ایک اہم حوالہ ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ذخیرہ کتب میں کئی سائنسی کتابیں شامل تھیں جن میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کو خاص فوقیت حاصل تھی۔ اقبال غالب کی طرح جدید علوم اور نظریات و ایجادات سے بہت متاثر تھے اور وہ اس کے فروغ کے خواہش مند بھی تھے۔ اقبال کے نزدیک سائنس ہماری روحانی زندگی کے لیے مشعل راہ نہیں بن سکتی، اس کے باوجود سائنس انسانیت کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جس طرح غالب اپنی تقریظ میں سرسید کو جدید علوم و فنون اور ایجادات کی طرف آنے کی تاکید کرتے ہیں اسی طرح اقبال بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے کہتے ہیں کہ اُردو کے لیے آپ کی کوششیں بڑی مبارک ہیں لیکن آپ کی توجہ صرف ادب پر ہے، ہونا یہ چاہیے کہ سائنس کی کتابیں اُردو میں منتقل ہوں تاکہ مسلمان خیالی دنیا سے نکل کر علمی دنیا میں قدم رکھ سکیں۔(۸) یوں دونوں شاعروں میں علمِ سائنس کے فروغ کی ایک ذہنی مشابہت جنم لیتی ہے۔ غالب کی نسبت اقبال کا

عہد ایک طرح سے سائنسی نوعیت کا عہد ہے جہاں صنعتی اور سائنسی انقلاب اپنے عروج پر ہے اور اقبالؔ اس ساری صورت حال سے آگاہ ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں شاعروں کے ادوار کا جائزہ اس امر کی دلیل ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے تحت پروان چڑھنے اور سائنسی ترقیوں کے رائج ہونے میں دونوں شاعروں کے ادوار میں بڑی حد تک مشابہت موجود ہے۔اس لیے دونوں شاعروں کے غیر معمولی اذہان نے اپنے عصر میں ہونے والی سائنسی اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں کو قبول و انجذاب کیا۔یہی تبدیلیاں اور مشابہت غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں پائے جانے والے سائنسی شعور اور سائنسی حسیت کا ایک مشترکہ حوالہ ثابت ہوتی ہیں۔یہاں ہم دونوں شاعروں کے یہاں پائے جانے والے سائنسی شعور کے تحت سائنسی نوعیت کے موضوعات کا تقابلی جائزہ لیں گے۔

زندگی کے ہر شعبہ اور ہر فن میں مشاہدہ (Observation) ایک کار آمد اور بڑی اہمیت کا حامل عنصر ہے۔مشاہدہ کے ذریعے انسان کسی ایک شے کو متنوع نقاطِ نگاہ سے دیکھتا ہے۔سائنس کی دنیا میں مشاہدہ ایک ناگزیر عمل ہے۔بل کہ یہ کسی بھی سائنس دان کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔سائنسی تحقیق کے طریقہ کار میں مشاہدہ کی بنیاد پر چھان پھٹک اور تحقیق و تدقیق کر کے ایک مفروضہ قائم کیا جاتا اور مسلسل تجربات کی کسوٹی پر اس کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔تاکہ اصول و ضوابط کی نظریہ سازی ممکن ہو۔لہٰذا قوتِ مشاہدہ ہر سائنس دان کی پہلی خاصیت اور طرۂ امتیاز ہے۔غالبؔ اور اقبالؔ کے موضوعات میں ایک اہم موضوع قوتِ مشاہدہ اور ذوقِ نظارہ کی طرف راغب ہونے کا زبردست اظہار یہ ملتا ہے۔اس مد میں پہلے "دیوانِ غالب جدید"(۹) کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیر لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے
ص(۳۱۳)

بخشے ہے جلوۂ گُل، ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
ص(۱۹۷)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
ص(۲۸۹)

درج بالا تینوں اشعار میں مشاہدہِ فطرت اور مشاہدہِ کائنات پر زور دیا گیا ہے۔غالبؔ نے ان موضوعات کو نہایت نازک خیالی اور رعایتِ لفظی کے حسین لباس میں شعر کا قالب عطا کیا ہے۔غالبؔ کا اپنا

مشاہدہ بھی غیر معمولی تھا اور وہ اسی کثرت سے دوسروں کو بھی کائنات کے فطری حقائق پر نگاہ ڈالنے پر اکساتے ہیں۔ پہلے شعر کی شرح میں ڈاکٹر سید حامد علی شاہ لکھتے ہیں:

> "کہا جاتا ہے کہ مشاہدہ (Observation) سائنسی علم حاصل کرنے کی پہلی اہم منزل ہے۔ ایک اچھے مشاہدے کے بغیر سائنس اچھا کام نہیں کر سکتا اور اچھے نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ غالب فرماتے ہیں کہ گہری نظر کے بغیر باغ کی سیر کرنے کی خواہش نہ کر۔ کیوں کہ لالہ زار کے پتوں پر اچھے اچھے اور چنیدہ اسباق لکھے ہوئے ہیں۔ لہذا آنکھ کھول کر باغ کی سیر کر، تاکہ قدرت کی کاریگری کو دیکھ سکے۔" (۱۰)

دوسرے شعر میں مصرع ثانی سے مراد آنکھ کا ہر کیفیت اور منظر سے سے لطف اندوز ہونا اور شوقِ مطالعہ کی تربیت کرنا ہے۔ جب کہ تیسرے شعر میں کثرتِ نظارہ یا سیر کائنات ایک منفرد اور نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس شعر کی سب سے اہم خوبی "حسد" کے علاج میں "گرمِ تماشا" اور "چشمِ تنگ" کے بدلے میں "کثرتِ نظارہ" کو رکھنا ہے۔ یہاں یہ شاعرانہ وصف غالب کے فن کا عمدہ نمونہ ہے جو صنعتِ تضاد کا تاثر دیتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس کا ظرف، علمی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی جس قدر زیادہ ہوتی ہے وہ تنگ نظری اور حسد جیسی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ سب کثرتِ نظارہ اور سیر کائنات سے ہی ممکن ہے۔ کیوں کہ اس طرح ذہن وسیع ہوتا ہے اور دل و نگاہ میں کشادگی آتی ہے۔ ایسا شخص پھر حسد یا تنگ نظری میں کبیدہ نہیں رہتا اور اس کی نگاہ عالمگیری حیثیت رکھتی ہے۔

اقبال کے یہاں بھی ایسے موضوع کی مشابہت پائی جاتی ہے جسے اقبال نے اپنے اچھوتے انداز میں عبارت کیا ہے۔ ان کی نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" سے شعری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں (۱۱)

ان اشعار میں واضح طور پر کائنات اور اس کے جملہ فطری مظاہر کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان اشعار میں جتنے بھی کائناتی اور فطری عناصر کا تذکرہ ہے ایک سائنس دان کی تحقیقی نگاہ کا اہم ترین حصہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ سائنسی تحقیق اور مشاہدے میں زمین، فلک، فضا، سورج، بادل اور صحرا و سمندر اہم حیثیت رکھتے ہیں اور سائنسی نگاہ ڈالنے پر ان کی ماہیت و حقیقت سامنے آتی ہے۔

غالب اور اقبال دونوں کی شاعری میں غور و فکر اور تجسس کے گہرے نقوش بھی پائے جاتے ہیں۔

بقول غالبؔ:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ص(۳۹۶)

انسان نے سبز و گل، ابر اور ہوا پر نگاہ کی تو اس کے ذہن میں کرید و تجسس کا مادہ پیدا ہوا کہ آخر یہ سب کے وجود کی سائنسی یا فطری وجوہ کیا ہیں؟ سبز و گل، ابر اور ہوا یہ تین عناصر سائنس کی مرہونِ منت آج بڑے وسیع تناظر میں اپنے اپنے وجود کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ لیکن غالبؔ کے اس سلیس شعر سے تجسس اور جستجو کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ دراصل سبز و گل، ابر اور ہوا کے استعارے میں شعر کائناتی اشیا کی حقیقت اور ماہیت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

ایسی ہی کچھ مشابہت اقبالؔ کو مضطرب و بے قرار رکھتی ہے۔ نظم "شمع" سے چند اشعار دیکھیے:

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے
گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی
ص(۷۶)

غالبؔ جہاں سبزہ و گل، ابر اور ہوا کی صورت استفہامیہ لہجہ اپناتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف اقبالؔ اسے آگہی سے منسوب کرتے ہیں کہ یہ آگہی ہی انسان کو کائنات کی کھوج اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں غور و فکر کرنے پر اکساتی ہے۔ اقبالؔ کی ایک نظم "ارض اللہ" میں بھی غالبؔ کی طرح استفہامیہ لہجے میں غور و فکر کی دعوت ہے۔ مگر یہ نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے علم الکلامی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ قوتِ مشاہدہ، غور و فکر، تجسس اور آگہی انسان کو آگے بڑھنے اور کائنات کی ماہیت اور اس کی سچائیاں تلاش کرنے میں کلیدی درجہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ سب عناصر استقرائی منطق کے قریب کرتے ہیں جو ایک طرح کا سائنسی رویہ ہے۔ عظیم سائنسی مفکر چارلس ڈارون نے کئی جزیروں اور ممالک کی سیر و سیاحت کی اور اس دوران گہرے مشاہدے اور غور و فکر کے نتائج میں اپنا نظریہ ارتقا پیش کیا۔ اسی طرح کئی دوسرے سائنس دانوں کی مثالیں موجود ہیں۔

ایک ماہرِ فلکیات کی نظر سے اُردو شاعری کا جائزہ لیں تو یہ علمِ فلکیات کے شعور سے معمور نظر

آتی ہے۔ جہاں چاند، سورج، ستارے اور سیارے وغیرہ کو تشبیہاتی اور استعاراتی نظام میں بڑے احسن اور جمالیاتی انداز میں برتا جاتا ہے۔ ایسا فلکیاتی شعور ہمیں غالب اور اقبال کے ہاں بھی برابر نظر آتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں شاعروں کے ہاں اجرام فلکی یعنی سورج، چاند ستاروں اور سیاروں کے بارے میں سائنسی نوعیت کی صداقتیں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں شاعروں کے ہاں "سورج اور ستاروں" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ دونوں کی شاعری میں اجرامِ فلکی کے لیے عمدہ و دلکش تراکیب اور منظر کشی ملتی ہے۔

غالب اور اقبال کا عہد علمی و فکری سرگرمیوں اور تحریکوں کے لیے بڑا معنی خیز تھا۔ دونوں کے ادوار میں بڑے بڑے داناؤں و حکماء جنم لے چکے تھے۔ غالب کے زمانے میں علمی و فکری ماحول کے کئی حوالے موجود ہیں۔ اس پر شبیر احمد خان غوری کا تحقیقی مضمون "عہدِ غالب کا علمی و فکری ماحول" پڑھنے سے متعلق ہے۔ جس میں اس دور میں بپا ہونے والی ہر علمی و فکری سرگرمی اور تحریک اور ان سے وابستہ علما و داناؤں کے مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "غالب کی عبقریت کی تشکیل میں بھی اُن کے فطری ذوق سخن سرائی اور خداداد ملکہ قادر الکلامی کے علاوہ ان کے عہد کی علمی و فکری تحریکوں نے اہم کردار انجام دیا تھا۔ اگرچہ یہ عمل بلاواسطہ سے زیادہ بالواسطہ تھا، پھر بھی اُن کی تخلیقات میں منظوم ہوں یا منثور، وقت کی اہم علمی و فکری سرگرمیوں کے اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔"(۱۲)

غالب کے عہد میں منطق و فلسفہ، ریاضیات و طبیعات، مابعد الطبیعات اور الٰہیات کے موضوعات میں لوگوں کی گہری دل چسپی تھی۔ یونانی فلاسفہ کے متنوع نکات پر بحث و تمحیص جاری رہتی۔ اس زمانے میں عناصر اور مادہ کے متعلق کئی تصورات پائے جاتے تھے اور یہ سب یونانی فلاسفی کے تتبع میں تھے۔ یہاں ہم اپنے موضوع کی مناسب سے کسی سائنسی نوعیت کی مثال درج کریں گے۔ اس دور میں ایک عناصر اربعہ کا مسئلہ یعنی مسئلہ "استحالہ عناصر" ہنگامہ گرم تھا۔ اس مسئلہ کی رو سے ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں تبدیل ہونا ہے۔ مثال کے طور پر پانی بخارات بن کر ہوا میں منقلب ہو جاتا ہے اور یہ تبخیرِ پانی کو گرمی پہنچانے کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوتی ہے۔ پھر بھاپ اس درجہ تحلیل ہو جاتی ہے کہ بالکل لطیف ہو جاتی ہے جیسا دیگچی میں کھولتے ہوئے پانی سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے اس مسئلہ کو شعری نزاکت میں حسنِ تعلیل سے کام لے کر عشق و عاشقی کے معاملے کی مدد سے سائنسی حقیقت ثابت کیا ہے۔ بہ قول غالب:

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
ص(۱۹۷)

یعنی پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے استدلال کیا گیا ہے کہ ضعیفی میں وقتِ گریہ آنسوؤں کے بجائے محض اب سرد آہیں بھری جاتی ہیں یعنی پانی (آنسو) نے ہوا (آہ) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جبھی دوسرے مصرع میں اس سائنسی حقیقت کو صاف دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنے عہد کے اس مسئلہ استحالہ عناصر کے قائل تھے۔

اسی طرح اقبالؔ کے عہد میں بھی کئی سائنس دانوں اور فلاسفہ کے تصورات کا تذکرہ آیا ہے اور وہ انھیں ایک دلچسپ تلمیحاتی نظام میں برتتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے اپنی تصنیف "محسناتِ اقبال" (۱۳) میں ان مستعمل تلمیحات کی سائنسی توجیہ و توضیح پیش کی ہے۔

مثلاً معروف فلسفی دموقراطس کا کائنات کو ایٹموں کا مجموعہ قرار دینا:

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلاف معنی تعلیم اہل دیں میں نے
ص(۱۰۸-۱۰۹)

گلیلیو کا دوربین کی مدد سے ستارے کے اسرار سمجھنا:

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
(ایضاً)

جدید ہیئت دان کوپرنیکس یا یہ انکشاف کہ سورج ساکن اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے:

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلہ گردش زمیں میں نے
(ایضاً)

آئزک نیوٹن کا قانون کشش ثقل دریافت کرنا:

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئنہ عقل دور بیں میں نے
(ایضاً)

مائکل فیراڈے کا برقی قوانین اور ولہلم رنگٹن کا ماورائی شعاعیں دریافت کرنا:

کیا اسیر شعاعوں کو ، برق مضطر کو
بنادی غیرت جنت یہ سر زمیں میں نے
(ایضاً)

یہ ایسے سائنس دان اور حکما ہیں جو غالب سے پہلے کے ہیں۔ لیکن ان کے تصورات کا چرچہ اقبال کے عہد میں عروج پر تھا۔ اس لیے اقبال کے ہاں ان کا تلمیحاتی انداز میں واضح طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب کے دور میں دموقرائطس کی فلاسفی ایٹم یا ذرہ کی کے مباحث سے لوگوں کی خاصی دلچسپی تھی۔ خود غالب کی شاعری میں ذروں کی دروں بینی پر بہت سے اشعار موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار آج کی جدید سائنس کی تعبیری روشنی میں بالکل درست توضیح پیش کرتے ہیں۔

ایٹم لاطینی زبان کے لفظ [ایٹوموس] سے ماخوز ہے جس کے معنی ناقابلِ تقسیم کے ہیں۔ اُردو میں اس کے لیے ذرہ اور جوہر جیسے الفاظ برتے گئے ہیں۔ ایٹم کے بارے میں سب سے پہلا تصور یونان کے ایک مشہور فلسفی دیموقرائطس (۴۶۰-۳۷۰ق۔م) نے پیش کیا۔ اس کے اس ایٹمی مفروضے کی رو سے تمام کائنات چھوٹے چھوٹے ناقابلِ تقسیم ذرات سے مل کر بنی ہے۔ یہ مفروضہ کئی حد تک بجا تھا۔ مگر اس فلسفی کے بعد کئی غیر معمولی دماغوں نے جنم لیا اور یہ ثابت کیا کہ ایٹم قابلِ تقسیم ہے۔ تجربات کی روشنی میں اس ایٹم کو چیرا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون جیسے ذیلی ذرات یا پارٹیکل پائے جاتے ہیں۔ جن پر منفی یا مثبت چارج ہوتا ہے۔ یہ ذیلی ذرات ہر وقت حالتِ ارتعاش میں رہتے ہیں۔ یعنی ان میں اضطراب و بے چینی کی کیفیت کا ایک عالم بپا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی ہوئی تو آلاتِ مشاہدات کے سبب یہ راز بھی کھلا کہ ذیلی ذرات مثلاً الیکٹرون بھی قابلِ تقسیم ہیں اور یہ قوارکس (Quarks) کے بنے ہوتے ہیں۔ مادہ کی تین بنیادی حالتیں ٹھوس، مائع اور گیس جب کہ ایک چوتھی حالت پلازمہ ہے۔ ٹھوس اشیا میں ایٹم آپس میں بہت قُربت میں جُڑے ہوتے ہیں اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ جب کہ مائع اور گیس میں یہ ایٹم آزادانہ طور پر حرکت میں ہوتے ہیں اور پلازمہ آئینز کی صورتیں ہیں۔ لہذا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی مادی شے کے ایٹموں میں حرکت ایک مسلم اصول اور قانون ہے۔ غالب کی شاعری میں ذرے اور جوہر پر بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ جو اپنے اندر کئی سائنسی سچائیاں رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے پرتو سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بے قرار ہے
(ص۳۴۹)

کس کی برقِ شوخیِ رفتار کا دلدادہ ہے
ذرّہ ذرّہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے(۱۴)

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
ص(۱۶۵)

درج بالا اشعار میں غالبؔ کا کمالِ فن دیکھیے کہ ان کے اس استعارہ و تلمیحاتی پیرائے میں کتنے خوبصورت شاعرانہ انداز سے ایٹم اور اس کے اصول حرکت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ذرات کی ایسی ہی واضح حرکت ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں محسوس ہوتی ہے۔ اقبالؔ تو ویسے بھی جوش و تحرک کے شاعر ہیں تو کیسے ممکن ہے ان کے ہاں یہ موضوع مفقود ہوتا۔ بہ قول اقبالؔ:

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
ص(۴۶۴)

اقبالؔ کے ان اشعار میں یہ حقیقت عیاں ہے کہ کوئی شے بھی سکون و ثبات میں نہیں بلکہ ہر ذرہ کائنات رقص کناں ہے۔

بیسویں صدی کے ایک عظیم سائنس دان آئن سٹائن (۱۹۵۵-۱۸۷۹ء) نے ایک مساوات e=mc2 پیش کی۔ اس مساوات نے فکری طور پر دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا۔ اس مساوات کے مطابق ماس اور توانائی ایک ہی شے کے دو رخ ہیں۔ یعنی یہ مساوات ہمیں بتاتی ہے کہ مادہ در اصل توانائی کی کثیف شکل ہے۔ یہ مساوات اس حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ ماس اور توانائی ایک دوسرے میں تغیر پزیر ہیں۔ یعنی ماس کو توانائی اور توانائی کو ماس میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ماس کو توانائی میں تبدیل کرنے کی نمائندہ مثالیں ایٹمی ہتھیار اور ایٹم بم کی صورتیں ہیں۔ ماس کو توانائی میں تبدیل کرنے کے لیے دو اہم جوہری تعامل سے گزرنا پڑتا ہے جنھیں فیوژن اور فشن تعامل کہتے ہیں۔ جوہری فیوژن تعامل (Nuclear Fusion) میں کسی ایٹم کے دو ہلکے نیوکلیائی مل کر ایک بھاری نیوکلیئس میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس دوران بہت سی توانائی اور تابکاری شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔ یہ عمل ستاروں میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔ جب کہ جوہری فشن تعامل (Nuclear Fission) میں کسی شے کے بھاری نیوکلیائی ماس میں ایک جیسے اور نسبتاً کم بھاری نیوکلیئس میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس عمل میں بہت سی توانائی خارج ہوتی ہے۔ اس کی ایک اہم ترین مثال یورینیم- ۲۳۵ ہے۔ یہ ایسا آئسوٹوپ ہے جسے ایٹم بم اور ایٹمی ہتھیار بنانے میں فیول کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی چند کلو گرام مقدار اتنی توانائی پیدا کرتی ہے کہ ہر شے کو جلا کر بھسم کر دے۔ اس ساری

بحث سے مراد یہ تھی کہ کچھ مخصوص عناصر کے حامل ایٹموں یا ذرات میں اس قدر توانائی اور قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ قیامت جیسا منظر بپا کر سکتے ہیں۔ جاپان کے دو شہر ہیروشیما اور ناگاساکی اس کی دل شکن اور اندوہناک مثالیں ہیں۔ لیکن یہاں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غالبؔ کے درج ذیل شعر میں اس ساری ایٹمی حقیقت کے نمایاں نقوش نظر آتے ہیں۔

اب منتظرِ شوقِ قیامت نہیں غالبؔ
دنیا کے ہر ذرّے میں سو حشر بپا ہیں(۱۵)

یعنی غالبؔ کہتے ہیں کہ اب ہمیں کسی قیامت کا انتظار نہیں کیوں دنیا کے ذرات میں قیامت برپا کرنے کی قوت اور توانائی موجود ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یورینیم-۲۳۵ کے ہر ذرے میں حشر بپا کرنے کی صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یورینیم کے علاوہ بھی ذرات پر مبنی بہت سے ایسے عناصر قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں جن کا جب تعامل کروایا جاتا ہے تو زبردست دھماکہ ہوتا ہے۔ یہ شعر غالبؔ کے وجدانی ادراک کا متحیر اظہار ہے، جس میں سائنسی تخیل کی اثر انگیزی شامل ہے۔

اقبالؔ نے اسی موضوع کو اپنے مانوس شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
ص(۳۰۲)

اقبالؔ نے اس شعر میں ذرے کی توانائی کو سورج کی توانائی کے مماثل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی ذرے کا دل چیریں تو اس میں سے خورشید کا لہو ٹپکتا ہے۔ خورشید کا لہو یہاں توانائی کا استعارہ ہے۔ جب کہ ذرے کا چیرنا، جوہری تعامل کا اشارندہ ہے۔ یہ شعر جوہر تعامل (Nuclear Fission) کی زبردست ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو ایٹمی ہتھیار اور بم میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی وضاحت اوپر درج ہے۔ اقبالؔ کا یہاں وجدانی ذوق نہیں بلکہ ان کا عصری اور سائنسی شعور نمایاں ہے۔

یہ وسیع و عریض کائنات ایک متجسس ذہن کو اپنے دلفریب اور دلکش نظاروں سے اس سوال پر مجبور کرتی ہے کہ یہ کائنات کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ ایسے کئی سوالات ہر دور میں رہے ہیں۔ کسی نے کہا یہ پانی سے بنی ہے، کسی نے کہا یہ محض چار عناصر ہوا، پانی، مٹی اور آگ سے بنی ہے اور کسی نے اسے ایٹموں کا لامحدود مجموعہ قرار دیا۔ اسی طرح ایک اور اہم سوال کائنات کے جامد یا متحرک ہونے کا تھا۔ ایسے بہت سے سوالوں نے ایک ذی شعور انسان کو بے چین رکھا۔ یہ تشنگی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر آخر کار سائنس جیسے عظیم شعبہ نے ان سارے سوالوں کے جواب علمی و منطقی اور تجرباتی بنیادوں پر فراہم کیے۔ اس نے بتایا کہ کائنات آج سے قریباً ۱۴ ارب سال پہلے بگ بینگ کی بدولت وجود میں آئی تھی۔ بگ بینگ سے مراد

دھماکہ (Explosion) نہیں بلکہ کائنات کا آغاز اور پھیلاو ہے۔ لیکن دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ آیا یہ اتنی بڑی کائنات رُکی ہوئی ہے یا حرارت و حرکت میں ہے۔ بیسویں صدی تک تو یہی خیالات رہے کہ یہ کائنات بذاتِ خود حرکت میں نہیں بل کہ اس کے اندر جو اجرامِ فلکی اور دیگر اشیا ہیں وہ حرکت پزیر ہیں۔ مختصر یہ کہ کائنات پھیل یا سکڑ نہیں رہی۔ اس طرح کائنات کے بارے میں جامد (Block universe) ہونے کا تصور عام تھا۔ لیکن بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک ممتاز ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے کائنات کے اس جامد تصور پر کاری ضرب لگائی اور یہ انکشاف کیا کہ کائنات میں ہماری کہکشاں یعنی ملکی وے کے علاوہ بھی بے شمار کہکشائیں موجود ہیں۔ جو ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں اور آپس میں فاصلہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی رفتار میں بھی اِضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے درمیانی فاصلے میں تیز رفتاری ہے اور یہ پھیلاؤ کائنات میں بگ بینگ کے وقت سے جاری و ساری ہے۔ یہ قدرتی اصول تھا جسے سائنسی تجربات کی مدد سے دریافت کیا گیا۔ غالؔب اور اقبالؔ کوئی سائنس دان تو نہیں تھے مگر ان دونوں نے کائنات کے بارے میں حیرت انگیز آفاقی صداقتوں کا تذکرہ کیا۔ اقبالؔ چوں کہ سائنس کی کتابیں پڑھتے تھے اور اپنے عہد کے نت نئے سائنسی نظریات سے آگاہ تھے اس لیے کائنات کے بارے میں ان کے تصورات ان کی نظم و نثر میں موجود ہیں۔ غالؔب نے آفاقی صداقتوں کا ادراک اپنے اجتماعی لاشعور اور وجدان سے حاصل کیا تھا۔ جب وہ ایک قدم اپنی تمنا کی اور بڑھتے تو دوسرا قدم اگلے دشتِ امکاں کی طرف رواں ہوتا۔ غالؔب اور اقبالؔ کی شاعری میں کائنات کے بارے میں جن تصورات کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ ارتقا، پھیلاؤ اور اس کی حرارت و حرکت کے بارے میں ہے۔ مثلاً کائنات کے پھیلاؤ کے بارے میں دونوں شاعروں کے ہاں ایک دلچسپ مشابہت دیکھیے:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
غالؔب، ص(۴۳۳)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں
اقبالؔ، ص(۳۶۴)

غالؔب نے اپنے شعر میں کائناتی پھیلاؤ کی اس حقیقت کو شعری استعارات کی صورت بیان کیا ہے۔ غالؔب کے ہاں "آئینہ" کائنات کا استعارہ ہے اور غالؔب کی شاعری میں کئی مقامات پر اسے اسی معنی میں برتا گیا ہے جب کہ "آرائشِ جمال" کی ترکیب کائنات کے پھیلاؤ اور ارتقا کا استعارہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ استعارہ ایڈون ہبل کے تصورِ کائناتی پھیلاؤ کی بہت عمدگی سے نمائندگی کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

نے اپنی کتاب "کلامِ محاسنِ غالب" میں اس شعر کو ڈارون کے نظریہ ارتقا سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری طرف اقبال نے کائناتی پھیلاؤ کی حقیقت کو بڑے سلیس اور سادگی سے شعری صورت میں ڈھالا ہے۔ اقبال نے یہاں قرآنی آیت سے استفادہ کیا ہے اور کائناتی پھیلاؤ کے خیال کو قرآنی آیت کے تصور "کن فیکون" سے منسوب کیا ہے، جس سے شعر میں ایک کلامی صورت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح دونوں شاعروں کے ہاں ہمیں کائنات کے اَن دیکھے اور اوجھل جہانوں کا انکشاف ہوتا نظر آتا ہے۔ بہ قول غالب:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا، کاش کے مکاں اپنا

ص(۱۹۵)

اس شعر میں لفظ "کاش" متکلم کی حسرت کا غماز ہے۔ سطحِ زمین سے جب ہم آسمان کا نظارہ کرتے ہیں تو ہمیں عرش اپنے حسن و جمال کا نظارہ دیتا ہے۔ لیکن انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ عرش سے ادھر یعنی عرش سے آگے کے منظر کو بھی دیکھ سکے وہاں کے جو ستارے، سیارے اور دیگر اجرام فلکی ہیں ان کا دیدار بھی کر سکے اور یہ تجسس اسے بے قرار رکھتا ہے۔ مصرع اولی "منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے" اسی مفہوم کا ترجمان ہے۔ غالب کے کائناتی ادراک نے اس بات کا اشارہ دیا کہ عرش سے اس پار بھی بہت کچھ دیدنی ہے۔ یہ شعر غالب کی وسعتِ نظر اور بلند تخیل کا عکاس ہے جو ہمیں عرش کے اس پار موجود اشیا کے بارے میں جستجو پر اُکساتا ہے۔ جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی گئی تو اس حسرت کو پورا کرنے کے لیے متجسس انسان نے دور بین ایجاد کی اور اس منظر کو دیدار کے قابل بنایا اور نہ صرف منظر دیکھے بلکہ چاند اور سیاروں پر کمند ڈالی اور وہاں تک اپنی رسائی کو ممکن بنایا۔ آج جدید ترین دور بینوں کے وسیلے سے انسان نے کئی لاکھوں اور کروڑوں نوری سال کے فاصلے پر موجود عرش سے ادھر کہکشاؤں اور ان میں بے تحاشا ستاروں کو عکس بند کیا ہے اور ماضی کے میں ہونے والے واقعات سے متعلق اہم ڈیٹا حاصل کر رہا ہے۔ یہ شعر ایک حسرت کی صورت میں نئے جہانوں کے انکشاف پر دال ہے۔ غالب کی نظر عرش سے پرے کے مکانوں پر ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے بھی اس شعر کا انسلاک طبیعات الہیات اور فلکیات سے کیا ہے۔ اقبال کے ہاں ایسے بے نمود اور ان دیکھے جہانوں کی پیش بینی ملاحظہ ہو:

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ص(۴۵۷)

چند غزلیہ اشعار ملاحظہ ہو:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی ، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
ص(۳۸۹-۳۹۰)

کائنات کے پھیلاؤ اور اس کے متحرک ہونے کے ساتھ اس کا سب سے اہم قانون اس کا ارتقا ہے۔ یہ قانونِ ارتقاء کائنات اور اس کے جملہ اجزا اور عناصر پر بھی ہوتا ہے۔ حیونات، نباتات، جمادات، بحر وبر اور خود حضرتِ انسان کی تخلیق لاکھوں کروڑوں سالوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ نظریہ ارتقا ایک خیال کی صورت ڈارون سے پہلے بھی موجود تھا۔ مگر ڈاورن نے علمِ حیاتیات کے ضمن میں اسے سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔ آج یہ نظریہ ایک مسلم سائنسی صداقت ہے۔ یاد رہے کہ ڈاورن کے نظریہ ارتقا کا اطلاق محض جانداروں کی انواع (Species) پر ہوتا ہے۔ اصولِ ارتقا سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کے اس کارخانے میں کسی شے کو قرار نہیں بلکہ ہر شے تغیر پزیر ہے۔ ارتقا کے اس نظریہ نے دنیا میں ایک نئی بحث کو جنم دیا اور لوگوں کی فکر کے دھارے بدل دیے۔ اس لیے دنیا کے ہر بڑے مفکر اور شاعر کے یہاں ارتقا کی کوئی صورت ضرور نظر آتی ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں بھی یہ نکتہ بڑے وثوق سے شعری بُنت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ بہ قول غالبؔ:

خوشی، خوشی کو نہ کہہ، غم کو غم نہ جان اسدؔ
قرار داخلِ اجزائے کائنات نہیں(۱۶)

اس شعر میں غالبؔ نے حُسن تعلیل سے کام لیا ہے اور مصرع اوّل کے لیے دوسرے مصرع سے شاعرانہ استدلال کیا ہے۔ جس سے دوسرے مصرع میں نظریہ ارتقا کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس شعر کے بارے میں ڈاکٹر سید حامد علی شاہ رقم طراز ہیں:

"سائنس کے اصول برائے ارتقا (Evolution) کے مطابق کائنات ایک شکل میں نہیں رہ سکتی۔ اس کے اجزا یا عناصر کو اپنی ہیئت اور جگہ بدلنا ضروری ہے۔ مثلاً لوہا پڑا پڑا ہوا کھاتا ہے یعنی تکسید کے عمل (Oxidation) سے زنگ (Iron oxide) بن جاتا ہے۔ اقبال نے اس خیال کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا کیا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

غالب نے تو اس خیال کو اپنے اشعار میں مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو علم ارتقا (Evolution) اور دنیا کے تغیر کا خاصا احساس تھا۔"(۱۷)

اس اقتباس میں شعر غالب کی سائنسی تعبیر کے ساتھ اقبال کے شعر کا بھی درج ہے۔ جو اصولِ ارتقا کے خیال سے تشابہ ہے۔ غالب نے دو جذباتی کیفیات "خوشی و غم" اور اقبال نے لفظ "زمانے" بمعنی "وقت" کو بالترتیب بے قرار اور متغیر کہہ کر اصولِ ارتقا کو منفرد انداز میں نشان زد کیا ہے۔

غالب کے برعکس اقبال کے زمانے میں سائنس اور صنعتی انقلاب عروج کی طرف گامزن تھا۔ اقبال مغرب کی ان ترقیوں سے جہاں متاثر تھے وہیں ان کی شاعری میں ان کے منفی اور سیاسی استعمال پر سخت تنقید بھی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کے کلام کا ایک اہم پہلو مغربی تہذیب پر کڑی تنقید ہے۔ اقبال کی اس تنقید پر جہاں بہت سے ناقدین اسے درست قرار دیتے ہیں وہیں دوسری طرف کچھ کے نزدیک اسے فکرِ اقبال کا المیہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نکتہ سے قطع نظر اقبال کی شاعری میں کچھ اشعار ایسے بھی نظر آتے ہیں ہیں جہاں ان کے انسانی وجود پر پڑنے والے اثرات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ مثلاً اقبال کا ایک شعر دیکھیے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
ص(۴۳۵)

یہ شعر اقبال کی مشہور نظم "لینن خدا کے حضور میں" سے لیا گیا ہے۔ نظم کے سیاق و سباق سے ہٹ کر صرف اس شعر پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی اور اس کے مضر اثرات کا زبردست اظہاریہ ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آج کے دور مین سائنس اور ٹیکنالوجی انتہائی مفید شعبہ ہائے جات ہیں۔ مگر ان کے منفی اور سیاسی استعمال سے انسانی احساسات و جذبات بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اعتدال سے متجاوز یا ان کا عادی ہو کر رہ جانا واقعی احساسِ مروت کو کچل دیتا ہے۔ ہمارے گرد و نواح میں بہت سے لوگ متنوع گیجٹس اور سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی لت میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ جن کے سبب وہ نفسیاتی و جسمانی طور پر ازکارِ رفتہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ سکرین پر ٹکی نظریں کمزور

اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف سائنس کے منفی استعمال سے ایٹمی ہتھیاروں کی پیداوار ہے۔ اس ضمن میں پیامبر سائنس برٹرنڈ رسل کی کتاب "معاشرے پر سائنس کے اثرات" بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

غالب اور اقبال کے سائنسی شعور کے تقابلی جائزہ کی روشنی میں درج بالا مذکورہ تمام شعری مثالیں یہ نقطہ نظر واضح کرتی ہیں کہ ان دو فقید المثال شاعروں کے یہاں موضوعات اور فکری ہم آہنگی میں مطابقت تو یکساں ہے لیکن دونوں کے ہاں اندازِ بیاں اور شاعرانہ بُنت مختلف ہے۔ دونوں کے تخیل میں مشابہت تو ہے لیکن اس کی پیش کش اپنے اپنے جداگانہ اسلوب کی نمائندہ ہے۔ اقبال نے جس قدر غالب سے اکتسابِ فیض کیا کسی دوسرے شاعر کے یہاں ایسی مثال نہیں ملتی۔ غالب کے وجدانی ادراک، اجتماعی لاشعور اور اقبال کی عصری علوم سے واقفیت نے ان کی شاعری میں ایسے موضوعات اور اسلوبِ نگارش کو جگہ دی جن سے سائنسی شعور کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں سائنس کے ساتھ فلسفے اور مذہب کے عناصر بھی کارفرما ہیں، جس سے علم الکلام کی صورت جنم لیتی ہے۔ جب کہ غالب تلمیحاتی و تشبیہاتی پیرائے میں کائناتی شعور اور آفاقی صداقتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اقبال اپنے ایک مخصوص نقطہ نظر میں رہتے ہیں جب کہ غالب کی نظر فردی سطح پر متنوع رنگوں کو اپنے اندر سموتی ہے۔ جس سے روزمرہ سائنسی فکر کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اقبال کے معاملے میں ایک تشنگی جو محسوس ہوتی ہے وہ نفسیاتی حقائق کی ہے۔ غالب کا تناظر نفسیاتی شعور کے حوالہ سے بہت وسیع ہے۔ ان کے ہر دوسرے شعر میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی صداقت پوشیدہ ہوتی ہے جو نیورو سائنس سے انسلاک کرتی ہے۔ جب کہ اقبال اس پہلو سے بہت کم استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں نظمیہ موضوع کی روشنی میں کرداروں کی نفسیات تو سامنے آتی ہے لیکن غالب کی طرح انسانی جذبات و احساسات کی غائر ترجمانی مفقود ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول "اقبال اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔"(۱۸)

بلاشبہ غالب اور اقبال کی شاعری اپنے ساختیے میں سائنسی شعور کی جھلکیاں صورت پزیر کیے ہوئے ہے، جس سے دونوں شاعروں کے کلام میں ایک اہم اور انوکھی جہت نشان زد ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

## حوالے


(۱) ڈاکٹر عبدالحق، بکھرے خیالات (اقبال کی ڈائری)، (دہلی: دہلی یونی ورسٹی، شعبہ اُردو، مارچ ۱۹۷۵ء)، ۷۳۔

(۲) ایضاً، ص ۷۱

(۳) ڈاکٹر سید عبداللہ، مسائل اقبال، (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، طبع اول ۱۹۷۴ء)، ۱۱۵-۱۱۶۔

(۴) شیخ عبدالقادر، دیباچہ (بانگِ درا)، مشمولہ کلیاتِ اقبال (اُردو)، ایضاً، ۳۵۔

(۵) ڈاکٹر عبدالحکیم خلیفہ، افکارِ غالب، (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۹۹ء)، ۱۷-۱۸۔

(۶) ڈاکٹر حامد کاشمیری، غالب کے تخلیقی سرچشمے، (سرینگر، کشمیر: ادارہ ادب، ۱۹۶۹ء)، ۱۲۴۔

(۷) ابنِ رسا خیرات، مطالعہ سائنس اور اقبال، مشمولہ تلاش اقبال (خالد حامدی مرتب)، (دہلی: ادارہ شہادت حق، طبع اول اکتوبر ۱۹۸۰ء)، ۲۱۸۔

(۸) ایضاً، ۲۲۰۔

(۹) مفتی محمد انوارالحق، (مرتبہ) دیوانِ غالب جدید (نسخہ حمیدیہ)، (بھوپال: دھیہ پردیش اُردو اکادمی، اشاعت دوم ۱۹۸۲ء)

(۱۰) سید حامد علی شاہ، غالب کا سائنسی شعور، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۵ء)، ۱۴۱۔

(۱۱) علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، (اسلام آباد: بک فاونڈیشن، اشاعتِ سوم، ۲۰۱۸ء)، ۴۷۰-۴۷۱۔

(۱۲) شبیر احمد غوری، عہدِ غالب کا علمی و فکری ماحول، انتخاب مقالاتِ غالب، مرتبہ: پروفیسر نزیر احمد، (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء)، ۱۶۰۔

(۱۳) ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، محسناتِ شعرِ اقبال، (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۰ء)، ۲۸۸۔

(۱۴) آسی الدنی (شارح)، مکمل شرح کلامِ غالب، (لکھنو: صدیق بک ڈپو، ۱۹۳۱ء)، ۹۳۔

(۱۵) ایضاً، ۱۹۲۔

(۱۶) ایضاً، ۱۹۰۔

(۱۷) سید حامد علی شاہ، غالب کا سائنسی شعور، ۶۹۔

(۱۸) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، غالب شاعرِ امروز و فردا، (لاہور: اظہار سنز، ستمبر ۱۹۷۰ء)، ۱۲۵۔



## REFERENCES


1. Abdul Haq, (Trans.) *Bikhre Khayalat (Iqbal ki Diary)*, (Dehli: Dehli University, Shoba Urdu, March 1975), p.73
2. ibid, p.71
3. Syed Abdullah, *Masa'il-e-Iqbal*, (Lahore: Maghribi Pakistan Urdu Academy, Taba' Awwal 1974), p.115-116
4. Abdul Qadir, *Dibaacha (Baang-e-Dara)*, Mashmoola Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), (Islamabad : Book foundation , Jan2018) P 35
5. Khalifa Abdul Hakim, *Afkaar-e-Ghalib*, (Dehli: Ghalib Institute Nai Dehli, 1999), p.17-18
6. Hamid Kashmiri, *Ghalib ke Takhleeqi Sarchashmay*, (Srinagar (Kashmir): Idara Adab Nashir, 1969), p.124
7. Ibn-e-Rasa Khairat, Mutala'a Science aur Iqbal, (Incl.) *Talaash-e-Iqbal (Khalid Hamidi Murattib)*, (Dehli: Idara Shahadat-e-Haqq, Taba' Awwal October 1980), p.218

8. ibid, P 220
9. Muhammad Anwar-ul-Haq, (Comp.) *Deewan-e-Ghalib Jadeed (Nuskha Hameediya)*, (Bhopal: Madhya Pradesh Urdu Academy, Isha'at Dom 1982)
10. Syed Hamed Ali Shah, *Ghalib ka Scientific Sha'oor*, (Karachi: Anjuman Taraqqi Urdu, 1995), p.141
11. Allama Muhammad Iqbal, *Kulliyat-e-Iqbal (Urdu)*, (Islamabad: Book Foundation, Isha'at-e-Soem January, 2018), p.470-471
12. Ghori, Khan, Shabbir Ahmad, *Ahd-e-Ghalib ka Ilmi wa Fikri Mahool*, Intikhab Maqalat-e-Ghalib (Murattib Professor Nazir Ahmad), (Dehli: Ghalib Institute, 1997), p.160
13. Baseera Ambareen, *Mohsinat-e-Sha'er-e-Iqbal*, (Lahore: Bazm-e-Iqbal, 2010), p.288
14. Aasi-ud-Din (Shar'eh), *Mukammal Sharh Kalam-e-Ghalib*, (Lucknow: Siddiq Book Depot, 1931), p. 93
15. ibid, p.192
16. ibid, p.190
17. Hamed Ali Shah, Syed, *Ghalib ka Sciency Sha'oor*, p.69
18. Farman Fateh Puri, *Ghalib Shaa'ir-e-Amroz-o Farda*, (Lahore: Izhar Sons Nashir, September 1970), p.125

❖❖❖